© rasailojaraid.com

قسطوں پر خرید و فروخت

حافظ نذیر احمد ہاشمی

موجودہ دور میں قسطوں پر خرید و فروخت تمام اسلامی ممالک میں مروّج ہو چکی ہے۔ عوام الناس کی اکثریت اشیاءِ ضرورت کی خریداری صرف قسطوں پر ہی کر سکتے ہیں' کیونکہ اس ہوشربا مہنگائی کے دور میں نقد خریدنا ان کی طاقت و استطاعت سے باہر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی بیع کا حکم از روئے شریعت بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اصل مسئلہ کی طرف آنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک مطلقاً ادھار پر کسی شے کے بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے تو قرآن و حدیث کی رو سے یہ قطعاً جائز ہے۔ چنانچہ اگر بائع اور مشتری باہمی رضامندی سے ثمن کی تاجیلاً ادائیگی پر متفق ہو جائیں' بشرطیکہ میعاد مقرر ہو' تو اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں۔ چنانچہ فقہ کی کتابوں میں صراحت کی گئی ہے:

"صح البیع بثمن حالٍ وبثمن مؤجّل الی اجل معلوم"

مزید برآں اس کے جواز پر آیتِ مداینہ اور رسول اللہ ﷺ کی وہ احادیث پیش کی جا سکتی ہیں جن میں خود رسول اللہ ﷺ کے دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے۔ چنانچہ متفق علیہ روایت ہے جس میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اشْتَرٰی طَعَامًا مِنْ یَھُوْدِیٍّ اِلٰی أَجَلٍ وَرَھَنَہٗ دِرْعًا مِنْ حَدِیْدٍ[1]

''رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ غلّہ اُدھار خریدا تھا اور (اس کے ثمن کے بدلے) لوہے کی زرہ اس کے ہاں رہن رکھ دی تھی۔''

علاوہ ازیں قرآن مجید میں قرضِ حسنہ کے متعلق جو تعلیم دی گئی ہے اس سے بھی صراحتاً اس اُدھار کا جواز ثابت ہوتا ہے جس پر کوئی اضافہ نہ ہو۔ کسی ضرورت مند کو اس کی ضرورت کی چیز اُدھار پر اُسی قیمت پر دینا جو نقد کی صورت میں ہو' قرضِ حسنہ کی تعریف میں آتا ہے' جو بڑے اجر و ثواب کا حامل ہے۔

قسطوں پر خرید و فروخت کا مطلب وہ بیع ہے جس میں بائع مبیع (بیچی جانے والی شے) کو اسی وقت خریدار کے حوالے کر دیتا ہے لیکن خریدار قیمت فی الحال ادا کرنے کے بجائے طے شدہ قسطوں کے مطابق ادا کرتا ہے' چاہے قیمت بازاری قیمت کے برابر ہو یا کم و بیش۔ لیکن چونکہ عام طور پر قسطوں پر بیع میں طے شدہ قیمت بازاری قیمت کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے' چنانچہ اگر خریدار اس شے کو نقد کے بدلے بازار سے خریدنا چاہے تو مقررہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے' لیکن اگر خریدار ادھار خریدنا چاہے گا تو بائع اس وقت اس کو بیچنے پر تیار ہوگا جب نقد کے مقابلے میں اس کو زیادہ قیمت وصول ہو۔ اس لیے عام طور پر قسطوں کی بیع میں نقد بیع کے مقابلے میں زیادہ قیمت مقرّر کی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ نقد کے مقابلے میں ادھار فروخت کرنے کی صورت میں قیمت میں زیادتی جائز ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں قدیم وجدید فقہاء نے بحثیں کی ہیں۔ چنانچہ علامہ شوکانی ''نیل الاوطار'' میں لکھتے ہیں:

يحرم بيع الشيء باكثر من سعر يومه لأجل النساء وقد ذهب الى ذٰلك زين العابدين علي بن الحسين والناصر والمنصور بالله والهادوية والامام يحيى۔ وقالت الشافعية والحنفية وزيد بن علي والمؤيد بالله والجمهور انه يجوز لعموم الأدلة القاضية بجوازه وهو الظاهر [۲]

''کسی چیز کا اُدھار کی وجہ سے موجودہ قیمت سے زیادہ قیمت پر بیچنا حرام ہے' اور یہ زین العابدین علی بن الحسین' الناصر' المنصور باللہ' ھادویہ اور امام یحییٰ کا مسلک ہے۔ جبکہ شافعیہ' حنفیہ' زید بن علی' مؤید باللہ اور جمہور علماء کے نزدیک یہ جائز ہے۔ یہ مسلک ظاہر (قوی) ہے' کیونکہ اس کے جواز پر دلالت کرنے والے دلائل میں عموم ہے۔''

مختصر یہ کہ نقد کے مقابلے میں ادھار بیع میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے' بشرطیکہ عاقدین بوقت عقد بیع کے مؤجّل یا معجّل ہونے کے بارے میں فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں۔ چنانچہ اگر بائع یہ کہے کہ نقد ثمن کی صورت میں مبیع مثلاً ہزار روپے اور ادھار ثمن میں بارہ سو روپے میں فروخت کرتا ہوں اور اس کے بعد کسی ایک قیمت کو طے کیے بغیر دونوں فریق علیحدہ ہو جائیں تو **جهالت في الثمن** کی بنیاد پر بیع ناجائز ہوگی' لیکن اگر مجلس عقد ہی میں کسی ایک ثمن پر عاقدین کا اتفاق ہو جائے تو یہ بیع جائز ہو جائے گی۔ چنانچہ امام ترمذیؒ نے سنن الترمذی میں ''**باب ما جاء في النهي عن بيعتين في بيعة**'' محمد بن عمرو' عن ابی سلمہ' عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی سند سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ''**نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ**'' کی وضاحت میں لکھا ہے:

قال ابوعيسى : حديث ابي هريرة حديث حسن صحيح' والعمل على هذا عند اهل العلم وقد فسر بعض اهل العلم' قالوا بيعتين في بيعة' ان يقول : ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين' ولا يفارقه على احد البيعين ' فاذا فارقه على احدهما' فلا بأس اذا كانت العقدة على احد منهما[۳]

''ابوعیسیٰ ترمذی کہتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہلِ علم کا اس پر عمل ہے۔ جبکہ بعض اہلِ علم نے اس حدیث کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ **بيعتين في بيعة** کا مطلب یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ یہ کپڑا میں آپ کو نقد میں دس روپے اور ادھار میں بیس روپے کا بیچتا ہوں اور پھر کسی ایک صورت پر اتفاق کیے بغیر دونوں علیحدہ ہو جاتے ہیں (تو یہ معاملہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک فاسد ہے' کیونکہ ثمن دو حالتوں میں متردّد ہونے کی بنا پر **جهالت في الثمن** کو مستلزم ہے جس کی بنا پر بیع ناجائز ہے' مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدت کے مقابلے میں ثمن کی زیادتی ممانعت کا سبب نہیں) لہٰذا اگر عقد کے وقت ہی کسی ایک حالت کی تعیین کر کے جہالتِ ثمن کا فساد دور کر دیا جائے تو پھر اس بیع کے جواز میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔"

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا مسلک بھی وہی ہے جو امام ترمذی نے بیان فرمایا ہے [٤] اور دلائل سے یہی مذہب راجح معلوم ہوتا ہے۔ کتاب الاصل المعروف بالمبسوط میں امام محمد فرماتے ہیں:

اذا باع الرجل بیعًا فقال :ھو بالنسیئۃ بکذا وبالنقد بکذا' کذا الی اجل کذا بکذا وکذا' فافترقا علی ھذا فانہ لا یجوز' بلغنا عن رسول اللّٰہ ﷺ انہ نھی عن شرطین فی بیع قال محمد حدثنا بذٰلک ابوحنیفۃ رفعہ الی النبی ﷺ۔

"جب اس طرح کوئی بیع کرے کہ ادھار پر اتنی قیمت ہے اور نقد پر اتنی قیمت یا ایک ماہ کی مدت پر اس کی قیمت یہ ہے اور دو ماہ کی مہلت پر قیمت وہ ہے اور پھر کسی ایک صورت کی تعیین کیے بغیر تردد کی حالت میں بائع اور مشتری جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں شرطین سے منع فرمایا ہے اور یہ حدیث امام ابوحنیفہؒ نے مرفوعاً ہمیں بیان کی۔"

اور کتاب الحجۃ علی اھل المدینۃ میں امام محمدؒ نے لکھا ہے:

قال ابوحنیفۃ فی رجل یکون لہ علی رجل مائۃ دینار الی اجل فاذا حلت قال لہ الذی علیہ الدین: بعنی سلعۃ یکون ثمنھا مائۃ دینار نقدًا بمائۃ وخمسین الی اجلٍ' ان ھذا جائز لانھما لم یشترطا شیئا ولم یذکرا امرا یفسد بہ الشراء ...... ھکذا یتبایع الناس لانھم اذا اخروا ازدادوا ما بأس بھذا [٥]

"امام ابوحنیفہؒ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا جس کے کسی دوسرے شخص کے ذمے سو دینار ایک مدت متعینہ تک واجب الادا تھے۔ جب مقررہ مدت ہوئی تو مدیون نے اس سے کہا کہ مجھے اپنی کوئی ایسی چیز جس کی نقد قیمت سو دینار ہو' ایک سو پچاس دینار میں ادھار بیچ دیں۔ اس معاملے کے بارے میں امام صاحب نے فرمایا کہ یہ جائز ہے کیونکہ دونوں (بائع اور مشتری) نے کوئی ایسی شرط اور مفسد بیع وشراء امر کا ذکر نہیں کیا ہے...... اسی طرح (ادھار کی صورت میں قیمت میں اضافہ) لوگوں کا معمول ہے کہ ادھار کی صورت میں وہ قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں۔"

علامہ سرخسی نے لکھا ہے:

اذا عقد العقد علی انہ الی اجل کذا بکذا وبالنقد بکذا اوقال الی شھر بکذا والی شھرین بکذا فھو فاسد لانہ لم یعاملہ علی ثمن معلوم ولنھی النبی ﷺ عن شرطین فی بیع وھذا ھو تفسیر الشرطین فی بیع [٦]

"یعنی جب عقد اس طرح کیا جائے کہ ادھار پر قیمت اتنی اور نقد پر اتنی یا ایک مہینے کی مدت پر اتنی اور دو مہینے کی مدت پر اتنی تو یہ عقد فاسد ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں ثمن میں جہالت ہے اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بیع میں دو شرطوں سے منع فرمایا ہے اور شرطین فی بیع کا یہی معنی ہے (ثمن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا مبیع میں تردّد)۔"

مندرجہ بالا معاملہ کے فاسد ہونے کی وجہ علامہ سرخسیؒ نے تردد فی الثمن بتائی ہے' جو اصولِ بیع اور نصِ صریح دونوں کے خلاف ہے' کیونکہ اس کے معاً بعد انہوں نے لکھا ہے:

وھذا اذا افترقا علی ھذا فان کانا یتراضیان بینھما ولم یتفرقا حتی قاطعه علی ثمن معلوم واتما العقد فھو جائز لانھما ما افترقا الا بعد تمام شرط صحة العقد

"فساد اس صورت میں کہ جب بائع اور مشتری اس متردد انہ حالت میں جدا ہو جائیں۔ لیکن اگر دونوں راضی ہو گئے اور جدا ہونے سے پہلے ثمن طے کر کے عقد کو اتمام تک پہنچا دیا (چاہے ادھار والی صورت یا نقد والی صورت میں) تو پھر یہ عقد جائز ہے' کیونکہ بائع اور مشتری صحتِ عقد کی شرط (تعیین ثمن) کو پورا کر کے جدا ہوئے ہیں۔"

لہٰذا بیع کے عام اصول (تعیین مبیع و ثمن) کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوئی اور نہ ہی حدیثِ رسول ﷺ کی۔ کیونکہ **شرطین فی بیع یا بیعتین فی بیعة** کے معنی علامہ سرخسی نے یہی بیان فرمائے ہیں کہ ثمن میں تردد ہو۔ جملہ کتب فقہیہ میں **زیادة ثمن للأجل** کے جواز کی تصریح ہے۔ ہدایہ **کتاب البیوع' باب المرابحة والتولیة** میں ہے:

ان للاجل شبھا بالمبیع الا تری انه یزاد فی الثمن لأجل الأجل۔ وکذا فی البحر الرائق وفتح القدیر وشرح التنویر والشامیة وغیرھا وزاد فی البحر الأجل فی نفسه لیس بمالٍ ولا یقابله شیء من الثمن حقیقةً اذا لم یشترط زیادة الثمن بمقابله قصدا ویزاد فی الثمن لاجله اذا ذکر الاجل بمقابلة زیادة الثمن قصدًا

"......اجل (مدت) بذاتِ خود مال نہیں اور نہ ہی اس کے مقابلے میں ثمن کا کوئی حصہ آ سکتا ہے اگر اس (بائع) نے ثمن میں زیادتی کو قصداً اجل کے مقابلے میں شرط نہ قرار دیا ہو' البتہ اجل کی بنا پر ثمن میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اگر اس نے ثمن میں زیادتی کے مقابلے میں قصداً اجل کا ذکر کیا ہے۔"

شرح الوقایہ باب المرابحہ میں ہے:

یزاد الثمن لاجلِ الاجل

"مدت کی وجہ سے ثمن میں زیادتی کی جا سکتی ہے۔"

النہر الفائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

ألا تری انه یزاد فی الثمن لاجله

باقی رہی "ہدایہ" کی **کتاب الصلح' باب الصلح فی الدین** کی عبارت "**الاعتیاض عن الاجل حرام**" تو اس کا جواب یہ ہے کہ اجل بحکم صفت ہے۔ اس عبارت کے حاشیہ میں ہے: "**لان الاجل صفة کالجودة**" اور صفت کا حکم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قیمت میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور ثمن میں اضافے کا باعث بھی بنتا ہے۔ البتہ بعد البیع ظہورِ فقدانِ صفت کی وجہ سے رجوع بالنقصان جائز نہیں کیونکہ صفت تابع ہوتی ہے اور منفرداً اس کے ضمان میں اس کا استقلال لازم آتا ہے۔ مختصر یہ کہ موصوف بالصفة کی قیمت تو زیادہ ہوتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے لیکن خود مستقلاً صفت کی قیمت نہیں ہے‘ جیسا کہ اموالِ ربویہ میں مبادلہ بالجنس کے وقت صفت کا اعتبار نہیں ہوتا۔ الغرض صفت کی وجہ سے ثمن میں اضافہ ہوتا ہے مگر دو صورتوں میں اس کا عوض جائز نہیں۔

(۱) رجوع بالنقصان (۲) مبادلہ بالجنس

مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں صفت کا عوض لینا صحیح نہیں۔ متعدد عباراتِ فقہیہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ رجوع بالنقصان کے وقت صفت کا عوض وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ مزید برآں رسول اللہ ﷺ کا اموال ربویہ کے بارے میں ارشاد گرامی ہے‘ جو عام اصول ہے: ’’جیدھا وردیھا سواء‘‘ یعنی جید اور ردّی کا مقابلہ برابر لینا ہوگا‘ جودت کے عوض زیادتی نہ دے سکتے ہو نہ لے سکتے ہو۔ بہترین کھجور کے ایک سیر کے بدلے میں معمولی کھجور کے دو سیر دینے لینے سے منع فرمایا‘ کیونکہ اس میں ایک سیر کے بدلے ایک سیر آ جاتا اور دوسرا سیر صفت جودت کے بدلے میں آ جاتا جو کہ ناجائز ہے‘ لیکن خود ہی آپ ﷺ نے ایک حیلہ بتا دیا کہ ردی کھجور کو کم قیمت پر بیچ دو‘ بجائے ایک سیر کے دو سیر فروخت کر دو اور پھر عمدہ کھجور زیادہ قیمت سے لے لو۔ عمدہ کھجور کی قیمت میں یہ اضافہ اسی وصف مرغوب (جودت) کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اس حقیقت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مرغوب شے کی قیمت نامرغوب کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ عمدہ کھجور والے کو معمولی کھجور کا ایک سیر اور ایک روپیہ بھی ساتھ دیا جائے‘ کیونکہ اس صورت میں یہ روپیہ یا یہ دوسرا سیر وصف جودت کے عوض ہوگا اور وصف کا عوض لینا جائز نہیں۔ لیکن عمدہ کھجور کو زیادہ قیمت پر خریدنا بالکل جائز ہے‘ حالانکہ یہاں بھی ثمن کی زیادتی وصف جودت کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے۔ یہی معاملہ اجل کا ہے کہ اس کا عوض لینا جائز نہیں لیکن لاجل الاجل ثمن کا بڑھ جانا فطری بات ہے‘ شریعت نے اس کو منع نہیں فرمایا اور فقہاء نے اس کی تعبیر درج ذیل الفاظ سے کی ہے:

ان الاجل لا یقابله الثمن اور **ان الثمن یزاد لأجل الاجل**

ہدایہ کی اصل عبارت کتاب الصلح میں اس طرح ہے:

ولو کانت له الف مؤجلة فصالحه علی خمس مائة حالةٍ لم یجز لان المعجل خیر من المؤجل ...... فیکون بازاء ماحطه عند وذٰلك اعتیاض عن الأجل وھو حرام

یعنی کسی کے کسی پر ہزار روپے ادھار ہیں اور وہ مدیون سے پانچ سو روپے حالاً پر صلح کرے تو یہ صلح جائز نہیں‘ کیونکہ معجّل مؤجل سے بہتر ہوتا ہے لہٰذا ہزار میں سے پانچ سو روپے (حالاً کی صورت میں) مؤجّل کو معجّل کرنے کا معاوضہ ہے جو کہ حرام ہے‘ کیونکہ اجل کا عوض لینا جائز نہیں۔

مندرجہ بالا صلح میں حرمت کا ایک سبب تو یہ ہے کہ قرض انتہاءً مبادلہ ہے اور اجل بحکم صفت کے مقابلے میں نصف قرض پانچ سو روپے مقروض کو مل رہا ہے جو کہ صفت کا عوض ہے۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ مقروض کو دین مع صفة الاجل دیا گیا تھا اور اب فقدانِ صفتِ اجل کی وجہ سے قرض خواہ پانچ سو میں رجوع کرتا ہے‘ لہٰذا جائز نہ ہوگا۔ اس طرح **فتاویٰ ھندیه‘ الباب العاشر**‘ ج۳‘ ص ۷۲ کی عبارت سے بھی بظاہر مسئلہ زیر بحث کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے۔ وہ عبارت اس طرح ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رَجُلٌ باع علی انه بالنقد بکذا وبالنسیئة بکذا او الی شهر بکذا والی شهرین بکذا لم یجز کذا فی الخلاصة

عالمگیریہ کی مندرجہ بالا عبارت سے معاملہ زیر بحث کا جو عدم جواز معلوم ہوتا ہے وہ اس صورت میں ہے کہ مجلس میں کسی ایک صورت کی تعیین کیے بغیر بائع اور مشتری علیحدہ ہو جائیں تو یہ صورت تردّد/جہالت فی الثمن کی وجہ سے ناجائز ہو گی‘ لیکن اگر مجلس میں طے ہو جائے کہ نقد لے گا یا ادھار تو عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔ چنانچہ ابن الہمام نے فتح القدیر کتاب البیوع کے اوائل میں لکھا ہے: **تحت قوله (ویجوز البیع بثمن حالٍ ومؤجل)**

واما البطلان فیما اذا قال بعتکه بالف حالاً وبالفین الی سنة فلجهالة الثمن (۷)

’’اس معاملے کا باطل ہونا‘ جس میں بائع مشتری سے کہے کہ نقد میں ہزار اور سال تک دو ہزار میں یہ چیز تمہیں بیچ دی‘ اس لیے ہے کہ ثمن میں جہالت ہے۔‘‘

یعنی اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ معاملہ ربا النسیہ میں داخل ہے بلکہ اس کی وجہ تردد/جہالت فی الثمن ہے‘ اگر ثمن کی تعیین ہو جائے تو پھر عدمِ جواز کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع یا ایک بیع میں دو شرطیں لگانے سے منع کرتے ہوئے فرمایا تھا:

عن ابی هریرة ؓ قال: ’’نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ‘‘ (۸) اور

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده قال قال رسول اللّٰه ﷺ: ((لَا یَحِلُّ سَلَفٌ وَبَیْعٌ‘ وَلَا شَرْطَانِ فِیْ بَیْعٍ‘ وَلَا رِبْحُ مَالَمْ یُضْمَنْ وَلَا بَیْعُ مَالَیْسَ عِنْدَكَ)) (۹) قال الترمذی حدیث حسن صحیح

جبکہ ابوداؤد نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے:

((مَنْ بَاعَ بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ فَلَهٗ اَوْکَسُهُمَا اَوِ الرِّبَا)) (۱۰)

اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو مختصر کرتے ہوئے صرف یہ ذکر کیا ہے:

((لَا یَحِلُّ بَیْعُ مَا لَیْسَ عِنْدَكَ وَلَا رِبْحُ مَالَمْ یُضْمَنْ)) (۱۱)

حدیث ابی ہریرہ ؓ **بیعتین فی بیعة** کی تفسیر میں اختلاف ہے‘ چنانچہ امام شافعی نے اس کے دو مفہوم بیان کیے ہیں:

(۱) بائع مشتری سے کہے: **بعتك بالفین نسیئةً وبالف نقدا فایهما شئت أخذت به علی ان البیع قد لزم فی احدهما وهذا بیع فاسد وباطل لانه ابهام وتعلیق** (۱۲) ’’میں نے یہ چیز تمہیں دو ہزار ادھار میں اور ہزار میں نقد بیچی‘ ان دو صورتوں میں جو صورت تم چاہو قبول کر لو‘ بنا بریں کہ بیع ان میں سے ایک صورت میں لازم ہو چکی ہے۔ یہ بیع فاسد اور باطل ہے‘ کیونکہ ایک تو اس میں ابہام اور دوسرے تعلیق ہے۔‘‘

(۲) دوسرا مفہوم یہ ہے: **بعتك ذا العبد علی ان تبیعنی دارك بکذا** ’’میں نے یہ غلام اس شرط پر تمہیں بیچا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ تم اپنا گھر مجھے بیچو گے۔''

پہلی صورت کی حرمت کی وجہ مقدارِ ثمن کی جہالت کے سبب اس معاملے کا غرر پر مشتمل ہونا ہے' کیونکہ خریدار کو عقد کی تکمیل تک یہ علم نہیں ہوتا کہ میرے ذمے ثمن کی مد میں دو ہزار کی ادائیگی ہے یا ایک ہزار کی۔

دوسری صورت کی حرمت کی وجہ دوسروں کی حاجات وضروریات سے ناحق فائدہ اٹھانا ہے جو ازروئے شریعت ناجائز ہے' کیونکہ بسا اوقات خریدار کو کسی شے کے خریدنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے' اس صورت میں بائع کا اس پر یہ شرط لگا دینا کہ میں یہ شے تجھے اس شرط پر فروخت کروں گا کہ تم اپنا گھر مجھے فروخت کرو' اس کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ چنانچہ مشتری اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر اسے اپنا گھر فروخت کرنے پر تیار تو ہو جاتا ہے لیکن گھر کے فروخت کرنے میں اس کی رضامندی شامل نہیں ہوتی اور اس طرح بیع ناجائز ہو جاتی ہے' کیونکہ بیع میں رضامندی ایک لازمی عنصر ہے۔ بمصداق آیت قرآنی:

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾

اور ''**شرطین فی بیع**'' کی تفسیر میں بھی مختلف اقوال ہیں:

(۱) بائع کہے کہ میں نے یہ چیز نقد میں اتنے اور ادھار میں اتنے پر تمہیں بیچی۔

(۲) بائع مشتری پر مبیع کے نہ بیچنے یا کسی کو ہبہ نہ کرنے کی شرط لگا دے۔

(۳) میں یہ شے تمہیں اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم مجھے اپنی فلاں چیز اتنے کی بیچو۔

(۴) بعض علماء نے اس کی وضاحت اس طرح بھی کی ہے کہ کسی نے ایک دینار کسی کو ایک قفیز گندم ایک ماہ تک دینے کے عوض دیا' مہینہ پورا ہونے پر جب مشتری نے اس سے گندم کا مطالبہ کیا تو بائع نے کہا وہ قفیز گندم جو میرے اوپر تمہیں دینا لازم ہے وہ مجھے دو ماہ تک دو قفیز گندم کے عوض بیچ دو۔ یہ صورت بھی **بیعتین فی بیعة** کی ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ **بیعتین فی بیعة** اور **الشرطین فی بیع واحد** یہ دونوں دراصل ایک ہی چیز ہیں۔ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے' کیونکہ ابہام اور تعلیق کی وجہ سے ثمن مجہول ہے اور اس میں قرار نہیں ہے کہ اس کی ادائیگی حالاً ہے یا مؤجلاً ہے۔ اگر اس ابہام کو رفع کر کے کسی ایک صورت کی تعیین ہو جائے تو عقد صحیح ہو جائے گا[۱۳] حاصل یہ کہ **بیعتین فی بیعة** کی حرمت کی علت **عدم استقرار الثمن فی صورة بیع الشیء الواحد بثمنین** ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ عقد باطل ہے' کیونکہ **جھالت فی الثمن** کی وجہ سے اس عقد کا تعلق **بیوع الغرر** سے ہو جاتا ہے' کیونکہ بائع کی طرف سے کسی ایک بیع پر جزم نہیں ہے۔ اس بیع کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے: **بعتك هذا او هذا** (میں نے تمہیں یہ بیچا یا یہ)۔

دوسری وجہ یہ کہ ثمن مجہول ہے لہٰذا عقد صحیح نہیں' جیسے **بیع بالرقم المجھول**۔ تیسری وجہ یہ کہ عوضین میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ایک عوض معلوم اور معیّن نہیں' اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے بعتك احد منازلي ''میں نے تجھے اپنے گھروں میں سے ایک گھر بیچا''۔(۱۴)

امام مالک کا مسلک ابن رشد نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اَمّا الوجه الثالث ' وهو ان يقول له : ابيعك هذا الثوب نقدًا بكذا او نسيئةً بكذا' فهذا ان كان البيع فيه واجبًا فلا خلاف في انه لا يجوز' واما اذا لم يكن البيع لازماً في احدهما فاجازه مالك ومنعه ابو حنيفة والشافعي' لانهما افترقا على ثمن غير معلوم' وجعله مالك من باب الخيار لانه اذا كان عنده على الخيار لم يتصور فيه ندم يوجب تحويل احد الثمنين في الآخر' وهذا عند مالك هو المانع' فعلة امتناع هذا الوجه الثالث عند ابي حنيفة والشافعي من جهة جهل الثمن' فهو عندهما من بيوع الغرر التي نهي عنها......(۱۵)

''تیسری صورت یہ ہے کہ میں اتنی قیمت نقد یا اتنی قیمت ادھار کے عوض یہ کپڑا تمہارے ہاتھ بیچتا ہوں۔ اگر اس صورت میں بیع لازم ٹھہرتی ہے تو اس کے ناجائز ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں اور اگر بیع لازم نہیں ہے تو امام مالک اسے جائز اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی ممنوع قرار دیتے ہیں' کیونکہ فریقین غیر متعین ثمن پر الگ ہوئے اور امام مالک نے اسے باب الخیار میں رکھا ہے' کیونکہ اگر اسے اختیار حاصل ہے تو اس ندامت کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو اس قیمت کو دوسری قیمت میں تبدیل کر دے اور امام مالک کے نزدیک مانع یہی ہے۔ اس طرح اس تیسری صورت کے ممنوع ہونے کی وجہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے ہاں ثمن سے ناواقفیت ہے اور یہ جہالت فی الثمن اس بیع کو بیع غرر میں تبدیل کر دیتی ہے جو ممنوع ہے۔''

بیع مؤجّل اور ربا النّسیئہ میں فرق

بیع مؤجّل/**بیع بالتقسیط** اور ربا میں اگرچہ بظاہر تشابہ ہے کہ بیع مؤجل اور **بیع بالتقسیط** دونوں میں قیمت کا اضافہ اجل کے مقابلہ میں نظر آتا ہے لیکن درحقیقت دونوں میں کئی وجوہ سے فرق ہے۔

(۱) اللہ عزوجل نے حاجت کی بنیاد پر بیع کو حلال فرمایا ہے: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾ اور ربا میں زیادتی محض مدت کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے حرام ہے' کیونکہ اجل (مدت) بمنزلہ وصف کے ہے اور اس کا معاوضہ لینا حرام ہے۔

(۲) ربا (سود) میں زیادتی بمقابلہ اجل اسی جنس سے ہوتی ہے جو مقروض کو ملا ہوتا ہے' مثلاً ایک مَن گندم دے کر مدتِ معینہ کے بعد ڈیڑھ مَن گندم لینا' یا ہزار درہم قرض اس شرط پر دینا کہ مدت معینہ کے بعد اس کی واپسی پندرہ سو درہم کی صورت میں ہوگی۔ جبکہ بیع مؤجل / **بیع بالتقسیط** میں محلِّ عقد (مبیع) سلعۃ (سامان) کی شکل میں ہوتا ہے جس کی نقد قیمت ہزار اور ادھار پندرہ سو ہوتی ہے۔ یہ معاملہ ربا نہیں ہے' کیونکہ مشتری کو سامان ملا ہے نہ کہ نقد دراہم۔ دوسرے مشتری نے قیمت پر جو اضافہ دیا ہے وہ خریدے ہوئے سامان کی جنس سے نہیں ہے۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ موجود شے بمقابلہ ادھار شے کے مرغوب فیہ اور ادھار کی قیمت نقد کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳) ربا النسیئۃ میں محلِ عقد (معقود علیہ) اثمان ہوتے ہیں جن کی قدر تو متعیّن ہوتی ہے لیکن وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ اعیان کے حصول کے وسائل اور ذرائع ہوتے ہیں۔ یہ اثمان چاہے پہلے سے معلوم ہوں' جیسے ابوبکر جصاص نے عربوں میں نزولِ قرآن کے وقت رائج ربا کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

والربا الذی کانت العرب تعرفه وتفعله انما کان قرض الدراهم والدنانیر الی اجلٍ بزیادة علی مقدار ما استقرض علی ما یتراضون (۱۶)

''وہ ربا جس سے عرب واقف تھے اور جو ان میں رائج تھا وہ درہم و دینار کا مدت معینہ تک قرض دے کر باہم رضامندی سے اس مقدار قرض پر اضافہ لینا تھا۔''

یا بائع و مشتری کے درمیان کسی عین کی خرید و فروخت کے نتیجے میں طے شدہ ہوں' جیسے بقول قتادہ:

اِنَّ ربا الجاهلية بیع الرجل المبیع الی اجل مسمی' فاذا حَلَّ الأجل ولم یکن عند صاحبه قضاء زاده وأخر عنه

''دورِ جاہلیت کا ربا یہ تھا کہ ایک شخص کوئی چیز دوسرے کو ایک مدتِ معیّن تک ادھار بیچتا تھا' جب مدت متعین پوری ہو جاتی اور مشتری کے پاس ادھار چکانے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو بائع مزید مہلت دے کر ثمن میں اضافہ کر لیتا تھا۔''

ان اثمان پر اضافہ بالاجل اور بغیر الاجل دونوں صورتوں میں ناجائز ہے۔ بالاجل تو اس لیے کہ نقود متعین القدر ہوتے ہیں' ان کی قیمت متعین ہوتی ہے' ان میں اضافہ نہیں ہو سکتا' لہٰذا اضافہ لامحالہ اجل کی طرف منسوب ہوگا جو ربا النسیئہ ہے اور از روئے قرآن مجید حرام ہے' کیونکہ اجل کی کوئی قیمت نہیں ہوتی (**ان الثمن لا یقابله شیء من الثمن**)۔ اور بغیر الاجل اس لیے کہ ربا الفضل ہے جو از روئے حدیث حرام ہے۔

(٤) بیع مؤجل میں کوئی شخص بلاشرکت غیرے کسی عین کا مالک ہوتا ہے' اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اعیان مقصود بالذات تو ہوتے ہیں لیکن ان کی قدر و قیمت متعین نہیں ہوتی' بلکہ اس کی قیمت کی تعیین میں مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ مختلف حالات' عوامل و اسباب کی بنیاد پر اس کی قیمت مختلف ہوتی رہتی ہے' ہر شخص اس کی قیمت کا تعین اپنی ضرورت و حالات کی بنیاد پر کرتا ہے۔ جس کی ضرورت جس قدر شدید ہوتی ہے اس کے نزدیک اس عین کی قدر و قیمت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح مالک عین بھی اپنی ضرورت اور اس میں شدت و کمی کی بنیاد پر اپنی مملوک عین کی قدر و قیمت مقرر کر کے کسی ایک آفر کو قبول کرتا ہے۔ اس عین کی قدر و قیمت کا حقیقی پیمانہ بازاری نرخ نہیں ہوتا جس پر زیادتی لازماً اس عین کی قدر و قیمت پر اضافہ شمار کیا جائے۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس عین کی بازاری قیمت اس کی اصل قدر و قیمت ہے اور اس پر اضافہ اجل اور میعاد کے مقابلے میں ہے۔

سودخور اگر کسی کو بطور قرض ایک سال تک ہزار روپے دے دیتا ہے یا کسی کو کوئی چیز ہزار روپے کے بدلے ایک سال تک ادھار دیتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ ایک ہزار روپے مجھے ایک سال بعد ملیں گے' میں ایک سال تک انتظار کرتا رہوں گا' کیوں نہ اس ایک سال کا معاوضہ مقروض اور مشتری سے لیا جائے' اس لیے وہ مقروض اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خریدار سے کہتا ہے کہ سال کے بعد تم مجھے ہزار کے بجائے گیارہ سو روپے دو گے' تو یہ سو روپے کا اضافہ اس تاخیر کا معاوضہ ہوگا جو کہ مال نہیں ہے' اور اگر سال بھر کے بعد ادائیگی نہ ہوئی تو اگلے سال کے لیے مزید ایک سو روپے دینا ہوگا۔ تو یہ اضافہ خود دَین کی ادائیگی میں مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے' جتنی مدت گزرتی جاتی ہے اسی تناسب سے اصل دَین پر اضافہ ہوتا رہتا ہے' جبکہ زیر بحث مسئلہ بیع مؤجّل میں یہ صورت نہیں' بلکہ تاجر اپنے ذہن میں سوچتا ہے کہ نقد ادائیگی کی صورت میں میں اپنی یہ چیز بازاری قیمت مثلاً سو روپے پر فروخت کر دوں' لیکن یہ شخص دو ماہ بعد ثمن کی ادائیگی کرے گا تو اس سے کہتا ہے کہ میں اپنی یہ چیز ایک سو دس روپے میں تمہیں فروخت کرتا ہوں' اگر تم دو ماہ کی میعاد پر یہ چیز خریدنا چاہتے ہو تو خرید لو اور خریدار دو ماہ کی میعاد پر وہ خرید لیتا ہے۔

اس معاملے کا ربا سے دو وجوہات سے فرق ہے:

(۱) دَین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی سے ثمن میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۲) مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا' مثلاً اگر کسی وجہ سے خریدار دو ماہ کے بعد ادائیگی نہ کر سکا تب بھی بائع کا اس سے مطالبہ ایک سو دس روپے ہی کا ہوتا ہے ایک سو پندرہ یا ایک سو بیس کا نہیں۔

حدیث نبویؐ ((کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَھُوَ الرِّبَا)) سے بھی بیع مؤجل / بیع بالتقسیط کے ناجائز ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ بیع مؤجل پر قرض کا اطلاق غلط ہے۔

عقد مداینہ کی تعریف علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر اور علامہ ابن العربی نے اپنی فقہی تفسیر ''احکام القرآن'' میں ان الفاظ میں کی ہے:

الدَّین عبارة عن کل معاملة کان احد العوضین فیھا نقداً والآخر نسیئةً فان العین عند العرب ما کان حاضرًا والدَّین ما کان غائباً (۱۷)

''دَین اس معاملے کو کہا جاتا ہے جس میں عوضین میں سے ایک عوض نقد اور دوسرا ادھار فی الذمہ ہو' کیونکہ جو چیز حاضر اور سامنے ہو عرب اس کو عین اور جو غائب ہو اس کو دَین کہتے ہیں۔''

اور ابوبکر جصاص نے لکھا ہے:

ومما یدل علی ان القرض لم یدخل فیه ان قوله تعالی "اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" قد اقتضی عقد المداینة ولیس القرض بعقد المداینة ...... فوجب ان یکون القرض خارجًا منه (۱۸)

''اور ان دلائل میں سے کہ قرض اس میں داخل نہیں ہے ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ''اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ'' ہے' کیونکہ اس ارشاد کا تقاضا عقد مداینہ ہے اور قرض عقد مداینہ نہیں .... پس واجب ہے کہ قرض اس سے خارج ہو۔''

قرض کی تعریف کے بارے میں علامہ ظفر احمد عثمانی نے حاشیہ ہدایہ سے صاحبِ کفایہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

اعلم ان القرض مال یقطعه من امواله فیعطیه' وما ثبت علیه دینا فلیس بقرض' والدَّین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

يشمل كل ما وجب في ذمته بعقد او استهلاك' وما صار في ذمته دينا باستقراض فهو اعم من القرض

''جان لو کہ قرض وہ مال ہوتا ہے جو اپنے مال سے جدا کر کے کوئی کسی کو دیتا ہے اور جو کسی کے ذمّے بطور دَین ثابت ہو وہ قرض نہیں۔ اور دَین شامل ہوتا ہے ہر اس شے کو جو کسی عقد یا استہلاک سے ذمّہ پر واجب ہو جاتا ہے یا وہ جو قرض لینے سے ذمے پر ثابت ہو جائے' پس دین اعم ہے قرض سے۔''

اسی طرح انہوں نے قرض کی تعریف میں صاحب مغرب کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

واما قول صاحب المغرب' القرض مال يقطعه الرجل من امواله فيعطيه عينا' فاما الحق الذي يثبت له دينا فليس بقرض ...... الخ فلا دلالة فيه على ان الدين لا يطلق على القرض بل معناه ان القرض لا يطلق على كل دَين(۱۹)

''صاحب مغرب کے اس قول ''قرض وہ مال ہوتا ہے جسے کوئی شخص اپنے اموال سے جدا کر کے کسی کو دیتا ہے اور جو حق اس کے لیے بطور دین ثابت ہوتا ہے تو وہ قرض نہیں ہے'' پس اس میں اس پر کوئی دلالت نہیں کہ دین کا اطلاق قرض پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر دین کو قرض نہیں کہا جاتا۔''

ہمارے زیر بحث مسئلہ بیع مؤجل/**بیع بالتقسیط** میں قرض سے فائدہ اٹھانے کا کوئی شائبہ ہی نہیں ہے' کیونکہ انعقادِ عقد سے قبل قیمت طے کرتے وقت قرض تو کیا دَین کا تحقق بھی نہیں ہے۔ جب قرض کا تحقق ہی نہیں تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا سوال؟

مزید ربا النسیئہ میں اجل کو باقاعدہ مستقل مبیع کی حیثیت سے اعتبار کیا جاتا ہے' چنانچہ قرض خواہ مقرّرہ مدت کے خاتمہ پر مقروض کے پاس جا کر کہتا ہے کہ میری مقررہ رقم جو تمہارے ذمّہ ہے وہ ادا کرو ورنہ اتنی مدّت مزید کے بعد مقررہ رقم پر اتنا اضافہ دو گے...... جبکہ معاملہ زیر بحث میں (یعنی بیع مؤجّل/**بیع بالتقسیط** میں) مفروضہ زیادتی معاوضہ کی حیثیت سے نہیں ہوتی نہ مقررہ میعاد کی کوئی قیمت مقرر کی جاتی ہے اور نہ عاقدین اس کو مبیع کا جزء تسلیم کرتے ہیں تاکہ کسی وقت مقررہ قیمت' مبیع اور اجل پر تقسیم ہو سکے۔ فقہاء اس زیادتی کے لیے ''بعوض الاجل'' کی جگہ ''لاجل الاجل'' کی علت ذکر کرتے ہیں' چنانچہ صاحبِ ہدایہ ''**یزاد فی الثمن لاجل الاجل**'' اور ابن عابدین وابن نجیم ''**یزاد فی الثمن لاجله**'' کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ گویا ربا النّسیئہ میں زیادتی ''بعوض الاجل'' اور ادھار بیع کے معاملہ میں ''لاجل الاجل'' ہے۔ واللہ اعلم!

حواشی

(۱) صحيح البخاري' كتاب البيوع' باب شراء النبي ﷺ بالنسيئة۔ وصحيح مسلم' كتاب المساقاة' باب الرهن وجوازه في الحضر كالسفر۔

(۲) نيل الاوطار'محمد بن علي بن محمد الشوكاني' ج۵' ص ۲۴۹ و ۲۵۰' باب بيعتين في بيعة۔

(۳) سنن الترمذي' كتاب البيوع' باب ما جاء في النهي عن بيعتين في بيعة' باب۱۸۔ ح:۱۲۳۱۔

(۴) الشرح الصغير على اقرب المسالك الى مذهب الامام مالك' ابوالبركات احمد بن محمد الدردير' ج۳'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ص ۹۳، البیوع الفاسدۃ۔ والمغنی علی مختصر الحزقی، احمد بن محمد القدامہ، ج٤، ص ١٦٨۔ والدسوقی علی الشرح الکبیر، ج٣، ص ٥٨۔ ومغنی المحتاج، للشربینی، ج٢، ص ٣١۔ والمبسوط للسرخسی ج١٣، ص٨۔

(٥) کتاب الحجۃ علی اھل المدینۃ، ج٢، ص ٢٩٥۔ (٦) المبسوط، للسرخسی، ج١٣، ص ٨۔

(٧) فتح القدیر، ج٥، ص ٨٤۔

(٨) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہﷺ، باب ما جاء فی النھی عن بیعتین فی بیعۃ۔

(٩) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہﷺ، باب ما جاء فی کراھیۃ ما لیس عندک۔

(١٠) سنن ابی داوٗد، کتاب الاجارۃ، باب فیمن باع بیعتین فی بیعۃ۔

(١١) سنن ابن ماجہ، ابواب التجارات، باب النھی عن بیع مالیس عندک وعن ربح مالم یضمن۔

(١٢) نیل الاوطار، ج٥، ص ٢٤٩۔

(١٣) بدائع الصنائع، ج٥، ص ١٥٨۔ وردّ المختار، ج٤، ص ٣٠۔

(١٤) المھذب، ج١، ص ٢٦٧۔ ومغنی المحتاج، ج٢، ص ٣١۔ والمغنی، ج٤، ص ١٦٨۔

(١٥) بدایۃ المجتھد، ج٢، ص ١١٥۔

(١٦) احکام القرآن، دار الفکر، بیروت، باب الربا، ج١، ص ٦٣٥۔

(١٧) تفسیر القرطبی، ج٢، ص ٢٤٣، تفسیر آیۃ الدَّین۔ واحکام القرآن لابن لعربی سورۃ البقرۃ تفسیر آیۃ ﴿اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾۔

(١٨) احکام القرآن ج١، ص ٦٥٩۔ دار الفکر، بیروت۔ (١٩) اعلاء السنن، ج٤، ص ٥٢٤۔

بقیہ: ماں اور بیٹے کی محبت نفسیاتی ہے؟

تین مرتبہ سوال کے جواب میں ماں کو حق دار قرار دیا اور چوتھی مرتبہ کے جواب میں باپ کو۔ اسی تناسب سے بیٹا ماں کا احترام زیادہ کرتا ہے۔

بہر حال ان رشتہ داروں کے درمیان محبت، شفقت اور رحم کی وجوہات وہ ہرگز نہیں جن کی طرف فرائڈ اور اس کے ہم نوا اشارہ کرتے ہیں۔ اگر اس میں حقیقت ہوتی تو ان کے درمیان اس قسم کے سکینڈل بھی اتنے ہی زیادہ سامنے آنے چاہئیں، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ جن ممالک میں آزادی زیادہ ہے وہاں بھی اس طرح کے کیسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے کہ ان کے تعلق کے محرکات وہ نہیں جو نفسیات والے بتاتے ہیں۔

کیا سارے لوگوں کی نفسیات ایک طرح کی ہے؟

مذکورہ بالا رشتہ کے حوالہ سے سارے لوگوں کی نفسیات وہی ہیں جن کی طرف مذکورہ بالا سطور میں اشارہ ہوا ہے۔ لیکن جن لوگوں کی فطرت مسخ ہو چکی ہے ان کی نفسیات شاید بدل چکی ہو۔ جیسے دنیا میں خاص طور پر مغرب میں ایسے لوگ موجود ہیں جو جنسی تسکین کے لیے جنس مخالف سے زیادہ دلچسپی اپنے ہم جنس میں لیتے ہیں یا کچھ خواتین اپنے نسوانی حسن کی حفاظت کی خاطر اولاد پیدا کرنے سے گریز کرتی ہیں، یا دیگر فطرت سے متصادم سوچ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی نفسیات عام اور سلیم الفطرت لوگوں سے مختلف ہو سکتی ہے۔ ○○

© rasailojaraid.com